HARF-O-SUKHAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

اکیسویں صدی کی ناول نگاری میں سماجی مسائل کی عکاسی

Reflection of social problems in 21st century novels

سعدیہ نیاز

ایم۔فل اُردو

Abstract:

The 21st century has been called the century of the novel. Since the beginning, many high-quality novels have appeared, including Bano Qudsia's novel "Raja Gidh" and Ali Akbar Natiq's novel "Kumariwala".In these novels, social evils has been depicted in a very good way. Social issues like alcoholism, dishonesty, not distinguishing between halal and haram, homosexuality, opportunism are important social evils of the 21st century. In the proposed research article, these two novels are based on An overview of the evils of the society has been done. Society and literature are closely related. A writer is born in a society and creates only by observing and studying the events of that society. No writer can perform literary services by avoiding the society. Therefore, a writer is not only the interpreter of his time, but he is an eyewitness of the history of his time and describes it in his own words.

Keywords: 21st century, "Raja Gidh", alcoholism, dishonesty, literature, avoiding, eyewitness

ادب چاہے تخلیقی ہو یا تنقیدی اس کا سماج کے ساتھ گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ایک ممکنہ حد تک ادب سماج کا جنم کردہ ہوتا ہے اور سماج کو متاثر بھی کرتا ہے۔ادباء کی فکری و فنی کاوش ادب اور سماج کے درمیان رابطہ کا کام کرتی ہے۔راجندر ناتھ شیدا"ادب فکر اور سماج"میں لکھتے ہیں:

> تخلیقی ادب سماجی حقائق سے تاثرات حاصل کر کے اور ان تاثرات میں اپنے مخصوص ذہنی عمل سے اپنی شخصیت کا رنگ بھر کر انہیں زبان کے سانچوں میں ڈھالتا ہے۔اس کا نقطہ آغاز ادب ہوتا ہے اور منتہا زندگی اور سماج۔"(۱)

سماج وہ مسکن ہے جہاں پر انسان رہائش پذیر ہوتا ہے۔وہ اپنے مسکن میں ہونے والی تمام سرگرمیوں کا بغور و فکر مشاہدہ کرتا ہے اور پھر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال کر کے انہیں ادب کی شکل فراہم کرتا ہے۔موجودہ صدی کو بلاشبہ اردو ناول کی صدی کہا جاسکتا ہے۔اس صدی کے آغاز سے ہی اردو افسانوی ادب میں تواتر سے ناول منظر عام پر آئے اور ابھی تک یہ آمد کامیابی سے جاری ہے۔ناول اپنے عہد کے گوناں گوں مسائل اور گردوپیش کے حالات کی سچی عکاسی کا موثر وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ڈاکٹر نعیم انیس"اکیسویں صدی میں اردو ناول"میں لکھتے ہیں:

> "اردو ناول کے آغاز سے اب تک جتنے ناول بھی لکھے گئے ہیں،ان کی تدریس سے ہم نہ صرف اس عہد سے بلکہ اس عہد کے تمام تر داخلی و خارجی حالات سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔اور یہ بھی سچ ہے کہ اردو ناولوں نے ہر دور میں انسانی زندگی،زمانے کی گردشیں،شکست و ریخت کے سلسلے ،سیاسی و سماجی مسائل،عروج و زوال کی داستانیں،تغیرات و تبدل،روایتوں کی پاسداری،تہذیب و ثقافت کی عکاسی،ادبی تحریکات کے احرات،اقتدار کی سازشیں اور زمانے کے بدلتے ہوئے رویے کی عکاسی کچھ اس انداز سے کی ہے کہ ان میں ہمارا پورا معاشرہ جلوہ گر نظر آتا ہے۔"(۲)

اکیسویں صدی ترقی یافتہ صدی کہلاتی ہے۔اس صدی میں جہاں سائنس اور زندگی کے دیگر شعبہ ہائے جات نے ترقی کی منازل برق رفتاری سے طے کی ہیں وہیں پر ادب نے بھی نئے زمانے کے بدلتے حالات و واقعات اور تبدیلیوں و ترقیوں کے پش نظر انہیں موضوع بنا کر اپنے وسیع دامن میں سمیٹ لیا۔اکیسویں صدی میں تخلیق کردہ ناولوں میں سماجی،سیاسی،معاشی،سوانحی،اصلاحی،اخلاقی و تہذیبی موضوعات شامل ہیں جن میں ادیب نے معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو برت کر قاری کو نئے جہان سے آشنائی بخشی ہے۔ان ناولوں میں موضوع کی انفرادیت،اسلوب کی دل کشی،طریقۂ اظہار کی آزادی،حقیقت کے ادراک سمیت ہر لحاظ سے ترقی کی نشانیاں ملتی ہیں۔انسانی حیات جس طرح کی کشمکش،شکست و ریخت،اتار چڑھاؤ اور انقلاب سے مقابل رہتی ہے اس کے اظہار کا بہترین وسیلہ ناول ہے کیونکہ ناول میں معاشرہ،فرد اور ذات کے داخلی و خارجی عناصر پیش کیے جاتے ہیں۔

سماج اور ادب آپس میں گہرے رشتے سے منسلک ہیں۔ایک ادیب سماج میں پیدا ہوتا ہے اور اسی سماج کے واقعات کے مشاہدے اور مطالعے سے ہی تخلیق کرتا ہے۔سماج سے کنارہ کش کو کر کوئی بھی ادیب ادبی خدمات سرانجام نہیں دے سکتا اس لیے ایک ادیب نہ صرف اپنے زمانے کا ترجمان ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے زمانی کی

تاریخ کا عینی شاہد بن کر اسے اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ ادب اور سماج چونک ایک دوسرے سے وابسطہ ہیں اس لیے سماجی مسائل کی بہترین عکاسی ادب کے ذریعے کی جاتی ہے۔ زندگی کے وسیع و عریض کینوس کی وضاحت ادب کی جس صنف میں ملتی ہے اسے ناول کہتے ہیں۔ اردو ادب میں دیگر مستعمل ادبی اصناف کی طرح ناول کی آمد بھی انگریزی ادب سے ہوئی۔ اردو میں ڈپٹی نذیر احمد کو پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے اگرچہ ان کے ناولوں میں مقصدیت کو بنیادی اہمیت رہی اور شروع میں تحریر کردہ ناول فنی اعتبار سے کئی جھول کے حامل رہے۔ نذیر احمد کے ناول اصلاح معاشرہ پر مبنی تھے اور سماج کے مسائل کا حل ناول میں خوبصورتی سے بیان کیا گیا۔ اس کے بعد عبد الحلیم شرر نے تاریخی و سماجی ناول نگاری کی اور یوں اردو ناول نگاری کو کم و بیش ایک سو چالیس برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس وقت میں معیاری اور غیر معیاری دونوں طرح کے ناول شایع ہوئے جنھیں قارئین کی بڑی تعداد نے اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی سند سے نوازا۔ کم و بیش ہر ناول میں معاشرے کا عکس پیش کیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی جس قدر قدر مختصر ہو رہی ہے ویسے ہی اس کے مسائل و سعت کی طرف گامزن ہیں۔ سماجی اور مذہبی اقدار ہوں یا سیاسی و ثقافتی تشخص کی بات ہو، سیاسی شعور کی فکر ہو یا پھر معاشی احساس، انسانی رشتوں کی چپقلش ہو یا پھر تانیثیت اور دولت کے مسائل ہوں معاصر اردو ناولوں نے ان تمام موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ پروفیسر انور پاشا "ہم عصر اردو ناول ایک مطالعہ " میں لکھتے ہیں:

> "معاصر ناولوں کی ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ عصری معاشرے کی خارجی حقیقتوں کا ہی احاطہ نہیں کرتے بلکہ خارجی وسیلے کے تجربے سے ہماری ذات کے نہاں خانے میں اتر کر ہماری خوابیدہ حس کو بے دار کرنے اور ہمارے ساکت وجدان میں تحرک پیدا کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں۔"(۳)

مجوزہ تحقیقی شہ پارہ اکیسویں صدی کی ناول نگاری میں سماجی مسائل کی عکاسی پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں اکیسویں صدی کے دو ناولوں کا سماجی عکس پیش کیا گیا ہے جس میں علی اکبر ناطق کا ناول "کماری والا" اور بانو قدسیہ کا شہرہ آفاق ناول "راجہ گدھ" شامل ہے۔ ادب اور معاشرے کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ ایک ادیب اپنی وسیع نظری اور ادبی بصیرت کی بناء پر جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے اپنی ادبی تخلیق کے قالب میں ڈھال کر قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اکیسویں صدی میں سماج کے بدلاؤ کی بے قابو لہر نے ہماری تہذیبی و ثقافتی زندگی کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اس صدی کے ناول نگاروں نے اپنی تخلیقات میں سماج کا عکس پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان ناول نگاروں میں علی اکبر ناطق کا نام سرفہرست ہے جن کے ناولوں میں سیاسی و سماجی بصیرت کے ساتھ مقصدیت بھی غالب رہتی ہے۔ انہوں نے سماج کا عکس پیش کر کے اردو ناول کے باب میں نیا اضافہ کیا ہے۔

علی اکبر ناطق کا شمار اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو ناول نگاروں میں معتبر مانا جاتا ہے۔ ان کے دو ناول "نولکھی کوٹھی" اور "کماری والا" اردو ناول نگاری کے دامن کو وسعت بخش چکے ہیں جس کی وجہ ان کا غضب کا مشاہدہ ہے۔ ناطق کے ناولوں میں حقیقی زندگی کی سچی اور کھری تصویر ملتی ہے جس سے وہ اپنے ناولوں میں زندگی کی ناہمواریوں اور سماج کی بے حسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ علی اکبر ناطق نے اپنے نئے ناول "کماری والا" میں پنجاب کی سرزمین سے مضبوط رشتے کی وضاحت کی ہے جس کے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> "ان کے فکشن میں پنجاب کی سرزمین میں غیر معمولی دلچسپی ان کے بیان میں غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیتی ہے۔"(۴)

"کماری والا" ناول میں علی اکبر ناطق نے کئی موضوعات کو شامل کیا ہے جس میں سماجی عکاسی اور سرکاری اداروں میں ہونے والی بددیانتی سرفہرست ہیں۔ سرکاری اداروں میں کام کرنے والے ملازم خدا بن کر عوام سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ سرکاری املاک کو لوگ ذاتی ملکیت سمجھ کر برتاؤ کرتے ہیں۔ ناول میں ایک کردار جلال دین گاؤں کی سرکاری ڈسپنسری میں ملازم ہوتا ہے جو کہ مجرمانہ ذہنیت کا مالک ہے۔ ڈسپنسری کے دیگر عملے کو بھی اسی راہ پر لگا کر دونوں ہاتھوں سے عوام کا مال کھاتے ہیں۔ یہ ہمارے سماج کا ایک بنیادی مسئلہ ہے جس میں کم و بیش ہر عہدے والا فرد اپنا حصہ ڈالتا رہتا ہے۔ چوری چکاری، دو نمبری اور فراڈ ہمارے سماج کے ایسے مسائل ہیں جن سے عام معاشرہ بہت متاثر ہوتا ہے۔ جلال دین بھی اسی فراڈی کا شکار ہے اور ڈسپنسری کی ادویات چوری کر کے بلیک مارکیٹ میں فروخت کر دیتا ہے جبکہ مریض ایڑیاں رگڑتے ہوئے مالکِ حق سے جا ملتے ہیں۔

> "ڈسپنسری میں حکومت کی طرف سے ملنے والی مفت دوائیاں جلال دین شہر میں جا کر دوبارہ بیچ آتا اور اس سے ملنے والے پیسے لوگوں کو ادھار دیتا ہے۔۔۔ نرس اور جلال دین آپس میں ملے ہوئے ہیں اور ساری دوائیاں بیچ دیتے ہیں۔۔۔ ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ اس کام میں ملوث تھا بلکہ جو بھی نیا ڈاکٹر آتا جلال دین اس کی آنکھوں کا تارا بن جاتا۔"(۵)

سماج کے دیگر مسائل کا ایک اہم سبب شراب نوشی ہے۔ یہ انسان کے دماغ کو مختل کر کے اسے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے اس وجہ سے شراب کو 'ام الخبائث' کہا گیا ہے۔ شراب نوشی کی لت میں مبتلا شخص ملک و ملت کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ سماج پر بوجھ ہوتے ہیں بلکہ انہیں معاشرے کا ناسور کہا جائے تو بہتر ہے۔ شراب نوشی کرنے والا شخص دیگر جرائم میں مبتلا ہو کر معاشرے کا حسن گہنا دیتا ہے۔ وہ چوری چکاری، ڈکیتی اور قتل و غارت گری جیسے جرائم کر کے شراب نوشی کے لیے مالی تعاون حاصل کرتا ہے۔ ناول "کماری والا" میں بھی شراب نوشی جیسے کریہہ فعل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو سماج کا اہم مسئلہ ہے۔ جلال نامی کردار ڈسپنسری میں آنے والی الکوحل کو اپنے جرائم پیشہ دوست کے ساتھ مل کر پیتا ہے۔ دونوں نہ صرف شراب نوشی کرتے ہیں بلکہ قومِ لوط کی طرح ہم جنس پرستی جیسے قبیح فعل کو بھی گاؤں کے ایک لڑکے شمیر کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

> "اسی کے ساتھ ایک کریہہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوا۔ شمیر چارپائی پر الٹا لیٹا تھا اور یہ ننگا تھا۔ اس کے ساتھ جلال دین بھی محض نیکر پہنے لیٹا تھا اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ الجھے ہوئے تھے۔۔۔ ابھی میری دہشت جاری تھی کہ عین اسی کوارٹر کے ایک کمرے سے وہی یونس نامی آدمی باہر نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ وہ بھی الف ننگا تھا اور ہاتھ میں ایک بڑی سی شیشی تھی۔ اس کا ننگا جسم انتہائی کریہہ لگ رہا تھا۔ پیٹ پر بڑھا ہوا گوشت سور کی چربی کی طرح لٹک رہا تھا۔ یہ بڑی مونچھوں والا جلال دین سے بھی بڑھ کر خوفناک اور گندا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بھی اسی بڑی چارپائی پر ان کے ساتھ لیٹ گیا۔ پھر دونوں مل کر شمیر کو چمٹ گئے۔"(۶)

کوئی بھی سماجی برائی کو انسان کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ وہ کہیں کا نہیں رہتا اور سماج میں اس کی عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ نشے اور جوئے میں مبتلا انسان اپنے خونی رشتوں کی پہچان بھول جاتا ہے کیونکہ اس کا خون سفید ہو جاتا ہے۔ "کماری والا" کا ایک کردار معیز جوئے اور نشے کی لت میں مبتلا ہے اور اپنی لت کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنے نانا اور نانی کو قتل کر دیتا ہے۔ ذہنی بے حسی اور نشے کی عادت مل کر انسان کو اس قدر ظالم بنا دیتی ہیں کہ وہ ذہنی تسکین کے لیے اپنوں کی قربانیاں پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا ہے۔ جوئے کی لت میں مبتلا اشخاص جو بعض اوقات اپنی بیوی اور بیٹی تک کو شرط میں ہار جاتے ہیں۔ محمد اشرف ملک اس صورتحال کو ان الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

> "ایک حاجت مند نشے کا عادی، جب نشے سے ٹوٹا ہوا ہو، جیب خالی اور غمِ روزگار سے بھی دل شکستہ ہو تو ایسے عالم میں اس کے لیے ادھر ادھر سے رقم بٹورنے یا آمادہ جرم کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ جب تک وہ مکمل نشے کی حالت میں ہو، تو وہ اپنی ہی دھن میں خیالات کی دنیا میں کھویا رہتا ہے۔۔۔ افرادِ خاندان کے لیے وہ باعث مصیبت اور ننگ و ناموس بن جاتا ہے۔ تہذیبی ضابطوں کی پرواہ کیے بغیر وہ حصول نشہ کے لیے رقم فراہم کرنے پر تل جاتا ہے۔ اخلاق سوز حرکات کے باعث احساس کم تری جنم لیتی ہے۔"(۷)

ہمارے سماج کا سب سے بڑا مسئلہ جاگیردارانہ نظام ہے جس میں ایک شخص مالک جب کہ باقی سب اس کی رعایا میں شمار ہوتے ہیں۔ مہذب معاشرے کا یہ دوغلا چہرہ اس قدر زیادہ کریہہ ہے کہ تہذیب یافتہ لوگ اس بات پر یقین کرنے سے منکر ہوتے ہیں کہ اونچے شملے اور خوش مزاج شخص کے چہرے کے پیچھے کا منظر کتنا مکروہ ہے۔ ایسے لوگ زر، زن اور زمین کی ہوس میں خونی رشتوں کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ ناول میں ایک کردار احمد بخش کا ہے جو اپنے چھوٹے بھائی صادق بخش کو زمین کے لیے قتل کرا دیتا ہے۔ بعد میں وہ اس قتل کو سڑک حادثے کا رخ دے کر چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ عرصے بعد احمد بخش کا بیٹا طلال اپنے دوسرے چچا اللہ بخش کو بھری عدالت میں قتل کرا دیتا ہے۔ اس مسئلے کو ناطق نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> "ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ فطے اوڈ نے اپنی قمیص کے نیچے سے دیسی لوہار کے ہاتھ سے بنا ہوا وہ طمنچہ نکال لیا جس میں ایل جی کار توس پڑتا تھا۔ یہ کارتو اس اتنا سخت اور زوردار تھا کہ ایک بھینسے کو مارنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے اللہ بخش کے دل کے اوپر رکھ کر گھوڑا دبا دیا۔ وہاں ایک ایسا دھماکہ ہوا کہ تمام عدالت کانپ اٹھی۔ جج بھاگ کر اپنے کمرے میں گھس گیا اور ہر طرف ہڑبونگ مچ گئی۔ اتنے میں فطے اوڈ نے کمرے کو کنڈی لگا دی تاکہ اللہ بخش کے گارڈ اندر نہ آ جائیں۔"(۸)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

ہمارے سماج میں مذاق اور ثقافت کے نام پر برائیوں کو پروان چڑھایا جاتا رہا ہے۔ملک کی کئی نامور شخصیات اپنے اقتدار کی آڑ میں فحاشی کے اڈے چلا رہی ہیں۔علی اکبر ناطق نے اپنے ناول "کماری والا" میں کچھ کردار ایسے ڈالے ہیں جو پروڈکشن ہاؤس کی آڑ میں جسم فروشی کا دھندہ چلاتے ہیں۔دونوں میاں بیوی نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جھانسے میں اتار کر ان کی فحش فلمیں بنا لیتے ہیں اور پھر انہیں بلیک میل کر کے باہر ملک بھیجتے ہیں لیکن جسم فروشی کی یہ دلدل ہی ان کا آخری ٹھکانہ ثابت ہوتی ہے۔فحاشی اور جسم فروشی ہمارے معاشرے میں عام ہو چکی ہے۔جس معاشرے میں تیس سال تک بالغ لڑکا اور لڑکی کنوارے ہوں وہاں پر زنا اور دیگر جنسی افعال عام ہو جاتے ہیں۔اس ضمن میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> فحاشی نام ہے ہر اس طریق عمل کا جو قانون قدرت یا سوسائٹی کے مقرر کردہ اصولوں کے خلاف خواہش نفس کو پورا کرنے کے لیے اختیار کیا جائے اور اس میں وہ صورت بھی شامل ہے جس کا تعلق کسب زر سے ہے اور جسے عصمت فروشی کہتے ہیں۔"(۹)

سماج میں ایسے جنسی واقعات کی بھرمار ہے جن میں مجرم اپنے شکار کی عمر، جنس، مقام و مرتبہ اور صنف کی پہچان کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا بلکہ اس کی نفسانی خواہش اسے اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ وہ سماج کو زک پہنچانا شروع ہو جاتے ہیں۔ان کی تحریروں میں ادبی جاذبیت اور چاشنی موجود ہے۔وہ اپنے زبان و بیان میں سادگی و سلاست سے کام لیتے ہیں۔ان کے اسلوب کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> "ناطق کی نثر سے مکالمہ اور بیانیہ کے نامانوس گوشوں پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ناطق کے فکشن کا قاری خود انسان اور فطرت کے پیچیدہ رشتوں، انسان اور انسان کے درمیان محبت اور آویزش سے بہرہ اندوز ہوتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔"(۱۰)

ناطق نے "کماری والا" لکھ کر اردو ادب میں خاطر خواہ مثبت اضافہ کیا ہے۔اس ناول میں کئی سماجی برائیوں جیسے ہم جنس پرستی، بے ایمانی، شراب نوشی، جوا، جسم فروشی اور دیگر معاشی و سماجی برائیوں کو بیان کیا ہے۔اکیسویں صدی کے دوسری اہم ناول نگار بانو قدسیہ ہیں۔بانو قدسیہ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ان کا شاہ کار ناول "راجہ گدھ" اکیسویں صدی کے اہم سماجی مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔عصرِ جدید میں خالص انسان کی پہچان مشکل ہو چکی ہے۔چہار سو نفسا نفسی کا دور دورہ ہے اور بھائی بھائی سے دست گریباں ہے۔"راجہ گدھ" موضوعاتی اعتبار سے نفسیاتی اور علامتی تخلیق اظہار کے جدید پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے۔معاشرے کے مسائل کو سچائی اور ایمانداری سے سامنے لانے میں بانو قدسیہ نے کسی طرح کی کسر نفسی سے کام نہیں کیا ہے۔"راجہ گدھ" کے کے متعلق ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> "بانو قدسیہ کا ناول "راجہ گدھ" ایک ایسے دور میں سامنے آیا جب ہمارے معاشرے میں ذات کی شکست و ریخت، اخلاقی زوال اور بے سمتی کا نمایاں احساس ہے۔یہ احساس اس پر آشوب دور میں اس بات کی علامت ہے کہ ہمیں اس امر کا ادراک ہو چکا ہے کہ ہماری اقدار اندر سے اس قدر گل سڑ چکی ہیں کہ اگر صورتحال میں تبدیلی کا اہتمام نہیں کیا گیا تو معاشرہ اپنی موت سے ہم کنار ہو جائے گا جس کا صریحاً مطلب یہ ہو گا کہ انسان زبردست ارتقاء کے باوجود اپنی ذات کے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے جبکہ جبکہ طور پر وہ ہدایت کی خواہش کر تا رہا ہے۔"(۱۱)

بانو قدسیہ نے اپنے اس ناول میں سماجی مسائل کا ایک نچوڑ پیش کیا ہے کہ ہر سماجی مسئلہ اور دقیقق صورتحال تب پیدا ہوتی ہے جب کوئی غیر اخلاقی، غیر فطرتی اور غیر اسلامی محرک کار فرما ہو۔اس ناول کے کرداروں میں قیوم، پروفیسر سہیل، سیمی شاہ اور آفتاب کے علاوہ امتل و دیگر کردار ہیں۔ہر کردار منفرد مقام رکھتا ہے اور فنی اعتبار سے مکمل ہے۔ناول کا آغاز سوشیالوجی کی کلاس کے ایک تعارفی لیکچر سے ہوتا ہے جس سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ سیمی شاہ جو کہ ایک بیوروکریٹ کی بیٹی ہے کلاس کی سب لڑکیوں میں منفرد اور ذہین ہے۔اس کی تربیت آزاد خیال معاشرے میں ہوئی اور سوچنے و سمجھنے کی آزادی اس کی گھٹی میں موجود ہے۔آفتاب کے افکار سے متاثر ہو کر وہ اسے اپنا دل دے بیٹھتی ہے لیکن وہ انکار کر دیتا ہے۔آفتاب سے بچھڑ کر اس کی حالت شکست خوردہ انسان سی ہو گئی اور وہ ٹوٹ گئی جسے بانو قدسیہ ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔

> "دراصل آفتاب سے بچھڑ کر سیمی کشش ثقل سے آزاد ہو گئی تھی۔۔۔لیکن کشش ثقل سے آزاد رہنے کے بعد جو بے سمتی پیدا ہوتی ہے اس سلسلے میں اسے کوئی باقاعدہ ٹریننگ نہ ملی تھی۔وہ گویا ان دنوں مافیا تلے سانس لے رہی تھی۔جہاں بیٹھ جاتی پہروں بیٹھی رہتی۔کہیں جب اس کی نظر جم جاتی تو پھر چینی کی گڑیا کی طرح اس طرف دیکھتی جاتی۔ایسے میں آفتاب کے نام

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.2 2024

کے علاوہ اور کوئی ٹیکہ کارگر نہ ہوتا۔ اس خلائی دور سے کئی کیفیتیں وابستہ ہوئیں۔ خود ترسی، بیزاری، تنہائی پسندی، مردم گزیدہ محرومی غرض یہ کہ افتاب کی کشش باقی نہ رہی تو کئی سمتیں پیدا ہوئیں۔۔۔ لیکن ہر سمت کے آگے ہمیشہ خلا ہوتا، خاموشی ہوتی ۔۔۔اندر کا پریشر بڑھتا چلا جاتا۔"(۱۲)

سماج میں کچھ لوگ اس قدر کمزور ہوتے ہیں کہ ان کی اپنی کوئی ارادی قوت باقی نہیں رہتی ہے۔ وہ جس سے کس قدر بات کر لیں وہ سچائی، نیک نیتی اور خلوص پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لیے معاشرہ اور دیگر سماجی واقعات سے نتائج کا ماحصل ان کی خود اعتمادی کو چھین لیتا ہے۔ آفتاب سے بچھڑ کر اسے قیوم نے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی قیوم کا اپنا مقصد پنہاں تھا۔ اس کی محبت ہوس اور نفس پر مبنی تھی جب کہ سیمی اس سے مختلف تھی۔ وہ ہر وقت آفتاب کی یادوں میں مگن رہتی ہے۔ عشق لاحاصل نے سیمی شاہ کو ایسی صورت حال سے دوچار کر دیا جس پر اسے کوئی اختیار نہ رہا اور وہ خود کشی کی طرف مائل ہو گئی۔ سیمی کی پاک محبت کا ایک ہی مقصد تھا جسے دردِ دل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ وہ قیوم کا شکریہ ان الفاظ میں کرتی ہے۔

"شکر ہے لاہور میں تم ہو قیوم۔۔۔ اگر تم نہ ہوتے تو میں آفتاب کی باتیں کس سے کرتی۔ تم میری بڑی ضرورت بن گئے ہو قیوم۔۔ سچی میں کسی حیدر کے ساتھ اب نہیں رہ سکتی۔۔۔ کیا کسی وقت آفتاب بھی مجھے اسی شدت سے یاد کرتا ہو گا۔"(۱۳)

وطن عزیز میں شروعاتی برسوں میں جو طبقاتی کشمکش رائج ہوئی سیمی کا المیہ اسی کشمکش کا ثمر تھا۔ معاشرے کے اونچے درجے میں جو تضاد ملتا ہے سیمی بھی اسی کا شکار بنی اگرچہ وہ صرف ایک عکس ہے۔ اس کے پاس روایات، اقدار، تعلقات سے کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔ ماں باپ، دوستوں اور چہار سو سے اڈتی مایوسی نے اسے ایک بند گلی میں دھکیل دیا جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہ ملا۔ قیوم کا کردار "راجہ گدھ" ناول میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایسے افراد کا نمائندہ ہے جو کمزور اور پسے ہوئے طبقات میں آنکھیں کھولتے ہیں۔ زندگی کی بے کسی اور آسائشات کی آرزو میں ناکامی کا سامنا انہیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ناول میں قیوم کے الفاظ ہیں:

"اسکول سے بھاگ جانے والے بچوں کی جگہ سکول میں نہیں ہوتی لیکن ایسے ہی باغی بچوں کو بنچ پر کھڑا کر کے ہمیشہ ان عظیم شخصیتوں کی روشن مثالیں دی جاتی ہیں جو خود سکولوں سے بھاگے تھے۔۔۔۔ میرے دل کی بنچ پر ماسٹر غلام رسول کے ساتھ کئی قدر آور شخصیتیں کھڑی تھیں۔ اسی تضاد کے باعث میں عمر بڑھنے کے باوجود اندر سے نہ بڑھ سکا اور میری شخصیت ایک ایسے درخت جیسی ہو گئی جیسے زیبائش کے لیے جاپان میں پالا جاتا ہے، جو سالوں پرانا ہوتا ہے لیکن جس کا قد ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"(۱۴)

ہماری سماجی صورتحال انتہائی ناگفتہ بہ ہونے کی وجہ سے قیوم جیسے کردار عام ملتے ہیں۔ معاشی بحران کا شکار معاشرہ اچھے استاد اور فتح مند مبلغ پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ قیوم کو ابتدائی سالوں میں وہ پرورش نصیب نہ ہوئی جو ابتدائی زندگی میں مناسب تربیت اور رہنمائی سے ملتی ہے۔ اس کی طبیعت میں احساس کمتری کا عنصر انہی سماجی مسائل کی بدولت در آیا جو بچپن سے وہ سہتا رہا۔ اس نے نہ صرف اسے کمزور اور لاچار کیا بلکہ وہ دوسروں کو بھی برباد کرتا رہا۔ اسے پڑھانے والے اساتذہ تک تضادات کا شکار رہے جس کی وجہ سے قیوم الجھنوں سے بچنے کی بجائے گہرائی میں چلا گیا۔ وہ کہتا ہے:

"میرا خیال تھا کہ اگر آنکھوں کے راستے دل میں داخل ہونے کا راستہ نہ ہو تو دل تک جانے کے اور بھی کئی راستے ہو سکتے ہیں ۔اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ دل کو صرف ایک راہ جاتی ہے اور وہ جسم کا راستہ نہیں ہے۔"(۱۵)

سیمی کی وفات کے بعد قیوم ہیجان میں مبتلا ہو گیا۔ اگرچہ اس کے دوسری لڑکیوں کے ساتھ بھی جسمانی تعلقات تھے لیکن سیمی اس کے لیے خاص تھی۔ وہ اس کی ایسی محبت تھی جس کے جسم پر اس نے قبضہ کر لیا لیکن اس کی روح کو نہ پا سکا۔ قیوم سیمی کا دل جیتنے کے لیے آفتاب بننے کا ناٹک کرتا ہے لیکن اسے کامیابی نہیں ملتی۔ اس تڑپن کا اظہار وہ یوں کرتا ہے:

"میں نے خفگی سے کہا۔۔ ہم بھی تو ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں سیمی، ہمیں کوئی محبت تھوڑی ہے۔۔۔۔۔ قیوم؟۔۔۔۔۔ ہیں قیوم۔"(۱۶)

پروفیسر سہیل قیوم کی حالت دیکھ کر اسے یوگا کرنے کا مشورہ دیتا ہے لیکن اس سے بھی قیوم کی صحت پر فرق نہیں پڑتا۔ قیوم ایک شادی شدہ عورت عابدہ سے بھی تعلقات استوار کرتا ہے لیکن یہ تعلق بھی اس کی ذہنی خلش کو دور نہیں کر پاتا۔ وہ السر، اینگزائٹی اور ڈپریشن کے اٹیک کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنی ذہنی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"صبح شیو کرتے مجھے اپنی شکل یوں نظر آتی جیسے روشنی کی سفید کرن طیف منشوری میں سے نکل کر سات رنگوں میں بدل جاتی ہے۔ سادہ شیشے میں میری شکل کئی شکلوں میں منتقل ہو جاتی۔ کسی عکس میں مونچھ غائب ہو جاتی کسی حصے میں بامیز بادشاہ جیسی داڑھی نظر آتی۔ کبھی کبھی اوپر والے ہونٹ پر لپ سٹک کا لیپ ہوتا۔ ناک میں چھوٹی سی نتھنی ہوتی۔ کبھی کسی چہرے کی آنکھیں غائب ہو جاتیں۔ آئینے میں نظر آنے والی صورتوں میں سے خوف زدہ ہو جاتا۔ پھر میں الماری کھول کر اندر دیکھتا۔ مجھے یقین تھا کہ الماری میں ٹرنک کے اندر گدھے کے نیچے مجھ سے مشابہ کئی بونے رہتے ہیں اور کسی دن مجھے اکیلا پا کر وہ مجھ پر اچانک حملہ آور ہو جائیں گے۔"(۱۷)

قیوم اس جنونی حالت پر قابو پانے کے لیے روشن نامی لڑکی سے بیاہ کرتا ہے لیکن جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکی ماں بننے والی ہے تو اسے پانچ دن بعد طلاق دے دیتا ہے۔ قیوم کی یہ صورتحال اخلاق کے دیوالیہ پن نکلنے کی داستان ہے۔ وہ جنسی بے راہ روی کا شکار رہتا ہے جو ہمارے سماج کا تلخ مسئلہ ہے جس سے ہر کوئی نظریں تو چرا لیتا ہے لیکن دل ہی دل میں بعض لوگ اس کی مذمت کرتے ہیں تو بعض چسکے لیتے ہیں۔ وہ عشق لاحاصل کا شکار ہوا۔ اسے سیمی نہ مل سکی جس کی وجہ سے وہ ذہنی پسماندگی کا شکار ہو گیا۔ اس عشق لاحاصل نے اس کے حصے میں فقط منفیت وارد کی۔ اس نے اسی منفی راہ میں اطمینان قلب کی تلاش چاہی لیکن اس کی تمام حیات محرومیوں سے لبریز تھی۔ جس دیوانگی نے اسے جنسی بے راہ روی کا شکار کیا وہ اسے انجام تک روحانی سکون کے لیے استعمال کرتا رہا لیکن سب بے سود رہا۔ اس کی فطرت میں مردار خوری غالب رہی اور یہی بانو قدسیہ کے ناول "راجہ گدھ" کا بنیادی موضوع ہے۔ بانو قدسیہ نے طوائف الملوکی کے شکار معاشرے کے ایک اور سماجی مسئلے طوائفوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ امتل کا کردار ایک طوائف کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کی ملاقات قیوم سے اتفاقاً ریڈیو اسٹیشن پر ہوتی ہے۔ امتل جس ماحول میں پرورش پاتی ہے وہاں جسم اور روح محض جنسی آسودگی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں دلوں کو شکار کرنا ایک مشغلہ سمجھا جاتا ہے۔ ماضی میں امتل کو استحصال کا نشانہ بنا پڑا اور جب جوانی گزری تو اس کے بیٹے کو یہ راز معلوم ہوا اور اس نے اپنی ماں کو قتل کر دیا۔ امتل کے مکالموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ موت اس کی خواہش کے عین مطابق ہوئی:

"اور تم نے کیا دعا مانگی ہے امتل؟ بس یہی۔۔۔۔۔ یہی سری زندگی تو کسی پیار والے کے ساتھ گزری نہیں۔ اب موت تو کسی پیارے کے ہاتھوں آئے۔۔۔ موت تو حلال ہو میری۔"(۱۸)

پروفیسر سہیل کا کردار بھی ناول میں اہم ترین ہے۔ ناول کے پلاٹ میں پروفیسر سہیل اہم جزو کا مقام رکھتے ہیں۔ کوثر کے ذریعے علم ہوتا ہے کہ وہ بھی قیوم اور سیمی شاہ کی طرح محبت کا شکار ہیں۔ ایک جگہ پر وہ اعتراف کرتے ملتے ہیں کہ ان کے کہنے پر ہی آفتاب سیمی سے دوری اختیار کرتا ہے۔ اس کی وجہ ان کے مطابق یہ تھی کہ سیمی میں وفا کا مادہ موجود نہیں ہے کیونکہ وہ ایک ایسے معاشرے میں پروان چڑھی ہے جہاں مدر پدر آزادی کا تصور موجود ہوتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری، سہیل کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سہیل کے کردار کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ سماجیات اور سائنس کی دنیاؤں کے خاک چھاننے کے بعد روح کی کائنات کی تفتیش اور جستجو میں منہمک ہو جاتا ہے اور بعض غیر تقلیدی نظریات کا اظہار شد و مد اور بھرپور ایمان و اتفاق کے ساتھ کرنے لگتا ہے۔ اس کا حتمی خیال ہے کہ جسم کی کثافت روح کو بھی کثیف اور غیر مظہر بنا کر چھوڑتی ہے۔"(۱۹)

ناول میں بنیادی طور پر دو پلاٹ استعمال ہوئے ہیں۔ ہر دوسرے باب میں بانو قدسیہ نے جانوروں کی کانفرنس کو موضوع بنایا ہے۔ یہ تمثیلی کردار انسانوں سے مماثلت رکھتے ہیں اور "راجہ گدھ" کی مردار کھا کر پیدا ہونے والی دیوانگی بھی ناول میں موضوع کی شکل اختیار کرتی ہے۔ بانو قدسیہ نے ایک نظریہ پیش کیا کہ عشق لاحاصل آرزوؤں کی تلاش میں بشر اپنا تشخص کھونے کے ساتھ ساتھ اپنے لیے صحیح سمت کا بھی ادراک نہیں کر سکتا۔ ایسی خواہشات انسان کو ذہنی و فکری طور پر مفلوج کر

دیتی ہیں۔لاحاصل خواہشات چاہے محبت کی ہوں، دولت کی ہوں یا حرام رزق کی تمام ایک کی صورت میں پنپتی ہیں۔انسان کو سماجی مسائل سے نکلنے کے لیے بانو قدسیہ نے تصوف کا سہارا لینے کا پیغام دیا ہے۔پروفیسر سہیل کے الفاظ میں:

”تم کو اپنے آپ کو کوئی سمت دینی ہوگی۔۔۔۔کوئی مشن اپنانا پڑے گا، کوئی گول، کوئی منزل۔۔۔۔ورنہ تم خالی بجرے کی طرح سمندری لہروں میں بھٹکوگے۔ کبھی بحر قلزم میں، کبھی بحیرہ عرب میں۔۔۔۔اپنے ارد گرد دیکھو۔۔۔۔جو لوگ زندگی میں کوئی مشن بنا لیتے ہیں، چاہے چھوٹے سے چھوٹا کیوں نہ ہو، وہ السر کا شکار نہیں ہوتے۔۔۔۔پیغمبروں کی زندگی کو غور سے دیکھو، وہ بڑی سے بڑی قربانی دے کر بھی السر کا شکار نہیں ہوتے۔۔۔کوئی ٹریجڈی انہیں ہلا نہیں سکتی۔۔۔۔بے نام جستجو، بے مصرف تلاش نہ ہو۔۔۔۔زندگی میں ایک مشن ہو، چاہے بالکل چھوٹا سا۔مثلاً بہتر کینو کا باغ لگانا۔۔۔۔پاکستان کے لیے نئی قسم کی گندم بونا۔۔۔پلاسٹک کی ڈوری سے قالین بننا۔۔۔کسی بچے کو سی ایس پی کرانا۔۔۔بھائی میرے۔۔۔۔بیمار ذہن کے مالک، کسی کے فائدے کے لیے مشن نہیں ہوتا۔۔۔اس کا فایدہ ہمیشہ مشن والے کو ہوتا ہے۔۔۔بڑے سے بڑا مشن ہو کائناتی قسم کا تو آدمی اللہ کا پیارا بن جاتا ہے۔گھٹیا کوالٹی کا آدم سائز ہو تو اپنے آپ کو آرام و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔“(۲۰)

پروفیسر سہیل جس سماجی مسئلے کا شکار ہیں اس سے ہمارے اساتذہ کی ایک کثیر تعداد نمٹ رہی ہے۔سماج میں استاد کو وہ عزت نہیں ملتی نہ ہی ان کو درس و تدریس کی آزادی میسر ہوتی ہے۔اس کا نتیجہ عدم اعتماد کی صورت میں نکلتا ہے۔اس کی ایک جھلک اس وقت دیکھی جاسکتی ہے جب کلاس روم میں طلبا شور کرتے ہیں تو پروفیسر سہیل انہیں آواز نیچی رکھنے کا کہتے ہیں تا کہ نظم وضبط برقرار رہے۔ان کا یہ کہنا کہ انتظامیہ انہیں عدم نظم وضبط کی وجہ سے یونیورسٹی سے نکال نہ دے، سماج میں استاد اور تعلیمی نظام کے خلاف بھیانک تصویر کا رخ دکھاتی ہے۔بانو قدسیہ نے حلال و حرام کا فلسفہ اور حرام و حلال رزق کے انسانی جسم پر اثرات کے تصور کو پروفیسر سہیل کی زبانی بیان کیا ہے:

”مغرب کے پاس حلال حرام کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی جینز کو متاثر کرتا ہے۔رزق حرام سے ایک خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات، شراب اور Radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔رزق حرام سے جو جینز تغیر پذیر ہوتے ہیں وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ ناامید بھی ہوتے ہیں۔نسل انسانی سے یہ جینز جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان Genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل بن کہتے ہیں۔یقین کرلو رزق حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے اور جن قوموں میں من حیث القوم رزق ہے حرام کھانے کا لپکا پڑ جائے۔مومن حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں۔“(۲۱)

ناول کو اختتام کی طرف کے جاتے ہوئے ایسا کردار تخلیق کیا گیا ہے جو دیوانگی کے محبت رخ کا ظاہر کرتا ہے۔آفتاب کی وطن واپسی اس کے بیٹے ابراہیم کے ساتھ ہوتی ہے۔ابراہیم ایسی دیوانگی کا شکار ہے جو نہ تو عشق لاحاصل سے حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی کسی اور جذبے سے بلکہ یہ ایسی دیوانگی ہوتی ہے جسے مصنفہ مقدس کہتی ہے۔پاک رزق اور جس کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہو اس سے پیدا ہوئی یہ دیوانگی رب کی عنایت ہوتی ہے۔ممتاز احمد خان لکھتے ہیں۔

”ناول میں بانو نے انسان کی تخلیق، اس کے ذہنی وفکری ارتقا اور اس کی جنسی نفسیات، اس کی تہذیب اور مذہب اور تصوف کے حوالوں سے کائنات میں اس کے مقام سے بحث کی ہے، مگر ان سب باتوں کا تانا بانا وہ فکری لحاظ سے تصوف وروحانیت سے جوڑ دیتی ہیں اور اپنے ایک اہم کردار پروفیسر سہیل کی وساطت سے قاری پر یہ تاثر چھوڑتی ہیں کہ ہمارے تمام تر معاشرتی عوارض کا حل روحانیت میں پوشیدہ ہے اور یہ کہ ہماری بداعمالیوں اور مغربی فلسفوں نے ہماری روح پر جو زخم ڈالے ہیں ان کا علاج فرائڈ کے نسخوں میں نہیں ملے گا کیونکہ اس کا طریقہ علاج روحانیت کو انسانی ذات سے خارج کرکے وضع کیا گیا ہے۔“(۲۲)

”راجہ گدھ“ میں مصنفہ نے جن سماجی مسائل کی عکاسی کی ہے وہ ہماری سماجی زندگی کے کثیر معاملات میں سماجی انتشار پیدا کرتے ہیں۔دولت کی ہوس ہو یا پھر عہدوں کا لالچ، رشوت، جنسی ہیجان، اقدار سے روگردانی، بے راہ روی، عدم مساوات، دوسروں کے حقوق غصب کرنا، عدم اطمینان جیسی بے شمار سماجی برائیاں انتشار

پھیلاتی ہیں۔معاشرے میں تقدس کا نام ونشان نہیں اور مسائل کا گرداب سماج کی جڑوں کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر رہا ہے۔اس کی بنیادی وجہ تعلیم کا فقدان اور صحیح خطوط پر پرورش نہ کرنا ہے۔محکمہ انصاف عوام کو انصاف فراہم کرنے سے قاصر ہے اور انصاف کی اس عدم دستیابی نے سماجی مسائل کو مزید بڑھاوا دیا ہے۔

اکیسویں صدی انتشار اور بدامنی کی صدی ہے۔دن بہ دن بدلتے سماج نے انسان کو نفسا نفسی کے عالم میں لا کھڑا کیا ہے۔وہ اخلاقیات کی حدود کو جان بوجھ کر شخصی فائدے کے لیے پامال کرتا ہے۔معاشرے کے اسی رخ کو ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں بطور موضوعات کے استعمال کیا ہے۔اکیسویں صدی کی ناول نگاری میں سماجی مسائل اردو ناول کے آغاز وارتقاء سے قدرے مختلف ہیں۔زمانے کی ترقی کے ساتھ سماجی جرم بھی ترقی کرتے ہیں اور قیام پاکستان کے بعد سے یہ مسائل بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔اکیسویں صدی کے منظر نامے میں کچھ خوبیاں بھی شامل ہوئی ہیں لیکن سماجی مسائل گھن کی طرح معاشرے کو متاثر کر رہے ہیں اس لیے ناول نگاروں نے ان موضوعات کو اس طرح ادب کے دامن میں سمیٹ لیا ہے کہ شاید ہی عام وخاص کی زندگی کی کوئی صورت اظہاریت سے مبرا ہو۔

حوالہ جات

۱۔ راجندر ناتھ شیدا،ادب فکر اور سماج،ص:۷

۲۔ نعیم انیس،ڈاکٹر،اکیسویں صدی میں اردو ناول،ص:۱۲

۳۔ ہم عصر اردو ناول ایک مطالعہ مرتبہ:قمر رئیس و علی احمد فاطمی نئی دہلی ص:۱۵

۴۔ شمس الرحمان فاروقی،نولکھی کوٹھی،از علی اکبر ناطق،فلیپ،جہلم بک کارنر،۲۰۲۰ء

۵۔ علی اکبر ناطق،کماری والا،جہلم،بک کارنر،۲۰۲۰ء،ص:۴۱

۶۔ ایضاً،ص:۱۴۲۔۱۴۳

۷۔ محمد اشرف ملک،مبادیات جرمیات،علم جرم فلسفہ جزا وسزا،لاہور،الکوثر پبلیکیشنز،۱۹۶۸ء،ص:۱۹۱

۸۔ علی اکبر ناطق،کماری والا،جہلم،بک کارنر،۲۰۲۰ء،ص:۱۴۲۔۱۴۳

۹۔ نیاز فتح پوری،ترغیبات جنسی یا شہوانیات،لاہور،آواز اشاعت گھر،۲۰۰۴ء،ص:۱۰

۱۰۔ شمس الرحمان فاروقی،نولکھی کوٹھی،از علی اکبر ناطق،فلیپ،جہلم بک کارنر،۲۰۲۰ء

۱۱۔ ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،اُردو ناول کے بدلتے تناظر،کراچی،ویلکم بک لمیٹڈ،۱۹۹۳ء،ص:۱۹۴

۱۲۔ بانو قدسیہ،راجہ گدھ،لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء،ص:۱۷۰

۱۳۔ ایضاً،ص:۱۴۳۔۱۴۴

۱۴۔ ایضاً،ص:۱۸

۱۵۔ ایضاً،ص:۱۲۳

۱۶۔ ایضاً،ص:۱۲۶

۱۷۔ ایضاً،ص:۳۸۶

۱۸۔ ایضاً،ص:۱۸۵

۱۹۔ انصاری،اسلوب احمد،اردو کے پندرہ ناول،علی گڑھ،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،۲۰۰۲ء،ص:۳۲۷

۲۰۔ ایضاً،ص:۲۷۶

۲۱۔ ممتاز احمد خان،راجہ گدھ۔نظریاتی کمٹمنٹ کا ناول،(مشمولہ)اردو ناول کے بدلتے تناظر،کراچی،ویلکم بک پورٹ لمیٹڈ،کراچی،۱۹۹۳ء،ص:۲۶۸

References In Roman:

1.Rajendra Nath Shida, Literature, Thought and Society, p.7

2.Naeem Anees, Dr., Urdu Novel in the 21st Century, p.12

3.Hamasar Urdu Novels,A Study: Qamar Rais and Ali Ahmed Fatemi New Delhi p:15

4.Shamsur Rahman Farooqui,Nau Lakhi KoThi, by Ali Akbar Natiq, Flap, Jhelum Book Corner, 2020

5.Ali Akbar Natiq, kamariwala, Jhelum, Book Corner, 2020, p.41

6.Ibid,p.142,143

7. Muhammad Ashraf Malik,"Fundamentals of Criminology, Criminology, Philosophy of Punishment", Lahore, Al-Kowsar Publications, 1968, p.191

8. Ali Akbar Natiq, Kumariwala, Jhelum, Book Corner, 2020, pp. 142, 143

9. Niaz Fatehpuri,Incentives for Sexuality or Eroticism, Lahore, Awaz Publishing House, 2004, p. 10.

10. Shamsur Rahman Farooqui,Naulkhi KoTh, az Ali Akbar Natiq, Flap, Jhelum Book Corner, 2020"

11. Mumtaz Ahmad Khan, Dr,Changing Perspectives of Urdu Novel, Karachi, Book Limited, 1993, p:194

12. Bano Qudsia, Raja Gidh, Lahore, Milestone Publications, 2002, p: 170

13.Ibid,p.143 144

14. Ibid,p.18

15.Ibid,p.113

16.Ibid,p.126,

17.Ibid,p.386

18.Ibid,p.385

19.Ansari, Aslob Ahmed, Fifteen Novels of Urdu, Aligarh Educational Book House ,Aligarh, 2002, p: 327

20. Ibid ,p.276

21.Mumtaz Ahmad Khan, Raja Gadh. A Novel of Ideological Commitment, (Including) Changing Perspectives of the Urdu Novel, Karachi, welcome Bookport Limited, Karachi,1993,p:268